Date of Publication: 02-02-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 03-04 Feb. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

# ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

8-14 February 2013
Issue: 6, Vol.:72

۸ تا ۱۴ر فروری ۲۰۱۳ء
شمارہ نمبر: ۶، جلد نمبر: ۷۲

# فلمی دنیا میں اردو کے سنہری دور کی یادیں

## جب اردو بلبلِ ہزار داستان کی طرح چہکتی تھی

وشوا ناتھ طاؤس (C-38، سیکٹر 39، نوئیڈا [یوپی] 201303)

اخبارات میں اکثر اس طرح کی خبریں پڑھنے کو مل جاتی ہیں کہ فلاں فلاں مقامات پر عوام نے کسی فلم کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا، فلمی پوسٹر اور بینر پھاڑ ڈالے یا کسی سینما گھر میں توڑ پھوڑ کی اور مطالبہ کیا کہ فلم کی نمائش پر پابندی عائد کر دی جائے۔ فلم کو سنسر بورڈ سے باقاعدہ سرٹیفکٹ ملنے کے بعد ہی مارکیٹ میں ریلیز کیا جاتا ہے مگر اس کے باوجود عوام کسی منظر پر بپھر جاتے ہیں، کوئی معمولی سا مکالمہ یا کسی نغمے کا ایک مصرعہ اشتعال کا موجب بن جاتا ہے اور لوگ جوش میں آکر سڑکوں پر اتر آتے ہیں۔ ایک جمہوری ملک میں عوام کو اپنے جذبات اور احساسات کا مظاہرہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔ کسی فلم ساز کو اختیار نہیں کہ وہ لوگوں کے مذہبی یا مسلکی جذبات سے کھیلے یا مختلف طبقات میں امتیاز پیدا کرے۔ فلم پروڈیوسروں کو اس امر کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کے عوام اپنے اعتقادات کے معاملے میں بڑے حساس ہیں اور انھیں اپنی دینی اقدار یا دھارمک جذبات سے کسی طرح کی چھیڑ چھاڑ گوارا نہیں۔ ترقی پسندی یا جدیدیت کا یہ مطلب نہیں کہ کسی کے دل کو ٹھیس پہنچائی جائے یا اس کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا جائے۔ عوام پر یہ فرض ضرور عائد ہوتا ہے کہ وہ پُرامن پروٹسٹ کریں اور قومی املاک اور سینما گھروں کو نقصان نہ پہنچائیں۔

ہمارے ملک میں احتجاج کا یہ سلسلہ فلموں کے آغاز سے چلا آرہا ہے۔ فلم سازی کے ابتدائی زمانے میں جب ہندو دیومالائی یا پورانک دھارمک داستانوں کو فلمایا جاتا تھا تو عوام کی مخالفت کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں جب واڈیا موی ٹون نے فلم 'داس اوتار' پیش کی تو کٹر ہندوؤں کے ایک گروہ نے پکچر ہال پر پکٹنگ کر دی کہ اس میں داسن کا پارٹ ہندو کی بجائے ایک پارسی ایکٹر نے کیوں ادا کیا ہے۔ بمبئی اور کلکتہ کے کئی دھارمک رہنماؤں نے بیان دیا کہ فلم میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہے مگر پھر بھی اس کی نمائش پر پابندی عائد کر دی گئی۔ واڈیا موی ٹون کی ایک اور دھارمک فلم کا بھی حشر ہوا چنانچہ اس ادارے نے وقتی طور پر مذہبی فلموں کی تیاری التوا میں ڈال دی اور پہلے کی طرح تھرلر اور اسٹنٹ تصویریں بنانی شروع کر دیں۔

متکلم فلموں کے اسی ابتدائی دور میں توحید پرستی اور کفر و الحاد کو موضوع بنا کر کئی فلمیں بنائی گئیں جن میں ستم گر دشمن، نور اسلام، ہلال عید، شیر اسلام کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ رنجیت موی ٹون نے بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے آخر میں ستم گر نام کی فلم تیار کی جس کی کہانی اور مکالمے مشہور ڈرامہ نگار پنڈت نارائن پرشاد بیتاب نے تحریر کیے تھے۔ اپنے دور کی حسین و جمیل اینگلو انڈین اداکارہ مادھوری نے اس میں ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ کہانی یہ تھی کہ خدا سے منکر ایک سپاہی جبار خدا پرست مسلمان لڑکی پر فدا ہو جاتا ہے اور ایمان پر اس کی پختگی کو دیکھ کر اللہ پر ایمان لے آتا ہے۔ چوں کہ جبار اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں سے ایک ہے اس لیے ایک منکرِ دین کردار کو اس نام سے پردے پر پیش کرنا کچھ دین دار مسلمانوں کو ناگوار گزرا۔ انھوں نے کئی مقامات پر احتجاجی مظاہرے کیے۔ علاوہ ازیں جبار کی جانب سے حق پرستوں کو گالیاں بھی انھیں ناگوار گزریں۔ حالات کی نزاکت کو دیکھ کر جذبات کو ٹھیس پہنچانے والے مناظر فلم سے کاٹ دیے گئے اور اس کے بعد ملک میں اس کی نمائش ہو سکی۔

تبلیغ کو لے کر فلم نور اسلام بنائی گئی جو ایک پاکیزہ فلم تھی۔ ڈی بلیموریہ اس کا ہیرو تھا اور یہ خوب چلی۔ ڈائرکٹر عطا محمد نے 'شیر اسلام' بنائی، وہ بھی کامیاب رہی۔ رنجیت موی ٹون نے صلیبی جنگوں پر مبنی پکچر 'صلاح الدین ایوبی' بنائی جس کی نمائش پر پہلے پابندی عائد کر دی گئی مگر بعد میں کچھ مناظر کاٹ کر اسے ریلیز کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ حافظ جی اس فلم کے ہدایت کار تھے مگر یہ کامیاب نہ ہو سکی۔

۱۹۳۳ء میں جب لاہور میں ایک دھارمک فلم 'نند کے لالا' کا پریس شو ہوا تو سناتن دھرم سبھا کی جانب سے روزنامہ 'ویر بھارت' میں مضمون چھپا کہ اس میں کچھ ایسے مناظر ہیں جو قابلِ اعتراض ہیں اور یہ فلم میں نہیں ہونے چاہئیں۔ ڈسٹری بیوٹر نے یہ فلم ہندوؤں کے ممتاز مذہبی رہنما گوسوامی گنیش دت جی، جناب شیو رام ذکی (معاون اڈیٹر 'ویر بھارت')، مہابیر دل کے آرگنائزر مسٹر لدھا سنگھ بھنڈاری و دیگر کئی دھارمک ہستیوں کو ایک خاص شو میں دکھائی اور ان سب نے فتویٰ دیا کہ فلم میں کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔

اخبار 'کرم ویر' کے اڈیٹر نند لال عیش اور جنرل منیجر کے۔ بی۔ ورما کا خیال تھا کہ یہ فلم واقعی قابلِ اعتراض ہے اور اس کی نمائش کے خلاف ایجی ٹیشن واجب ہے۔ عیش صاحب اور مسٹر ورما کے جوان خون نے جوش مارا اور انھوں نے اپنے اخبار میں پے در پے مضامین لکھ کر لوگوں کو ایجی ٹیشن پر آمادہ کر لیا۔ وہ لاہور کے ہندوؤں کی ایک ممتاز شخصیت ڈاکٹر خان چند دیو سے ملے اور بتایا کہ ایک طوائف زبیدہ نے اس فلم میں ہیروئن کا رول ادا کیا ہے اور یہ ایکٹرس 'زرینہ' جیسی فحش فلم میں کام کرنے کی وجہ سے بدنام ہے، علاوہ ازیں ایک مسلمان نوجوان شاہو موڈک کو اس میں شری کرشن جی کے روپ میں پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر خان چند دیو سوچ میں پڑ گئے اور کہنے لگے اس معاملے میں پبلک ایجی ٹیشن کرنا مناسب نہ ہوگا۔ عیش اور ورما اس جواب سے بہت مایوس ہوئے۔

مشہور کانگریسی لیڈر اور ہندو جگت کے ہر دلعزیز رہنما پنڈت مدن موہن مالویہ اگلے روز لاہور پہنچ رہے تھے۔ اخبار 'ویر بھارت' کی پیشانی پر سرپرست کے طور پر مالویہ جی کا نام لکھا رہتا تھا۔ عیش صاحب نے طے کیا کہ وہ مالویہ جی سے سارا ماجرا بیان کریں گے۔ مالویہ جی برانڈرتھ روڈ پر ایک ہندو رئیس کی شاندار بڑی کوٹھی میں قیام پذیر تھے، ملاقاتیوں کا تانتا لگا ہوا تھا جن میں بڑے بڑے سیاسی اور سماجی لیڈر شامل تھے۔ ایک جرنلسٹ کا فائدہ عیش جی کو ملا اور مالویہ جی کے پرائیویٹ سکریٹری نے چند منٹ کی ملاقات کا اہتمام کر دیا۔ عیش

نے مدعا بیان کیا کہ فلم 'نند کے لالہ' میں ایک طوائف کا رادھا کا رول ادا کرنا اور ایک ہلکٹک شاہو مووک کا کرشن جی کا پارٹ کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں اور اس سے ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ مسٹر مالویہ نے بات سننے کے بعد ادھر اُدھر نظر دوڑائی کہ اخبار 'ویر بھارت' کا کوئی کارکن نظر آئے تو اس ضمن میں بات کریں۔ انھیں اخبار کے ایڈیٹر شری سیوک رام نظر آئے۔ انھیں پاس بلا کر کہا کہ معاملہ بہت سنجیدہ ہے، میں نے فلم نہیں دیکھی مگر ایسا ارتھ نہیں ہونا چاہیے۔ قطعی فیصلہ اگلے روز تک ٹال دیا گیا۔

بخش صاحب نے دفتر پہنچ کر جنرل منیجر ورما کو پوری بات کہہ سنائی۔ ورما نے جواب دیا: "اب ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔ مالویہ جی کی توجہ دلا دینا ہی بڑی کامیابی ہے۔ اس سے زیادہ ہمارے بس کا روگ نہیں اور مہابیر دل کے سینکڑوں رضاکار ہمیں برانڈرتھ روڈ کے نزدیک بھی نہیں بھٹکنے دیں گے۔ فلم والوں نے انھیں شیشے میں اُتار لیا ہے۔"

اخبار 'ویر بھارت' کے مدیر شری جو رام سیوک نند لال بخش کے گھر پہنچ گئے اور کہنے لگے کہ فلم کی ریلیز کے بارے میں ساری ذمہ داری میں نے لے لی ہے اور بہتر یہی ہے کہ کل آپ مالویہ جی سے نہ ملیں، یہ سناتن دھرم سبھا کی عزت کا سوال ہے۔ بلاشبہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے مگر آئندہ نہیں ہوگی۔ بخش اور ورما کو معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ امن عامہ کا خطرہ تھا لہٰذا دونوں نے جو رام سیوک کو یقین دلایا کہ اب ہم مالویہ جی سے ملنے نہیں جائیں گے۔ دراصل اندر کھاتے دنیاوی طریقے سے فلم ڈسٹری بیوٹر اور اخبار سے وابستہ افراد کے درمیان تنازعہ نپٹ گیا تھا۔ کسی اور کو اس بارے میں پتا نہیں چلا۔ اگلے روز 'ویر بھارت' میں خبر چھپی کہ چوں کہ اس بات کا خطرہ ہے کہ کچھ لوگ کوئی مظاہرہ کریں یا شرارت پیدا کریں اس لیے برانڈرتھ روڈ پر مہابیر دل کے پانچ سو والنٹیروں کا پہرہ لگا دیا گیا ہے اور سبھی راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ اس طرح ایجی ٹیشن فیل ہو گئی اور فلم کی ریلیز کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔

بلدیو چند بیکل امرتسری اردو اور پنجابی زبان کے مانے ہوئے شاعر تھے۔ وہ لاہور کے ادبی و فلمی حلقوں میں خاصے مقبول تھے۔ مشاعروں میں اُن کا کلام اشتیاق سے سنا جاتا تھا اور اخبارات و رسائل میں اُن کی غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی تھیں۔ وہ مشہور گلوکار کے۔ ایل۔ سہگل کے بڑے مداح تھے۔ انھوں نے اظہار عقیدت کے طور پر سہگل کے لیے دو پنجابی غزلیں لکھیں "او سوہنے ساقیا میری گلی وچ پھیرا پاؤندا جائیں" (اے خوب صورت ساقی میری گلی کا چکر بھی لگا جانا) اور "ماہی نال ہے اکھ لڑی کدی نا" (اگر محبوب کے ساتھ میری آنکھ نہ لڑتی تو)۔ یہ دونوں غزلیں ہز ماسٹرز وائس کمپنی نے سہگل کی آواز میں ریکارڈ کیں اور یہ گراموفون ریکارڈ بڑی تعداد میں فروخت ہوئے۔ سہگل اور بیکل آپس میں اچھے دوست بن گئے اور یہ دوستی ہمیشہ قائم رہی۔

کے۔ ایل۔ سہگل کی زندگی نے زیادہ وفا نہ کی اور وہ ۱۸ رجنوری ۱۹۴۷ء کو اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ بیکل نے جب یہ منحوس خبر سنی تو کاغذ پر ایک گیت لکھ رہے تھے، انھوں نے کاغذ پھاڑ دیا اور قسم کھائی کہ پانچ برس تک کوئی گیت نہیں لکھوں گا۔

شاعری سے کیا کنارہ کشی کی آب و دانہ چھوٹ گئے۔ فلم ساز اور گراموفون کمپنی والے گیت غزلیں لکھنے کی فرمائش کرتے مگر وہ مالی مشکلات کے باوجود اپنے عہد پر قائم رہے اور کچھ لکھنے سے برابر انکار کرتے رہے۔ اس دوران میں ملک تقسیم ہوا اور بیکل لاہور چھوڑ کر بمبئی چلے آئے۔ جب پانچ سال پورے ہوئے تو فلمی مارکیٹ سے اُن کا نام غائب ہو چکا تھا اور کوئی انھیں چانس دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کافی دوڑ دھوپ کے بعد انھیں ایک پنجابی فلم میں گیت لکھنے کا چانس مل گیا۔ یہ فلم کامیاب رہی اور بیکل کے نغمے ایک بار پھر لوگوں کی زبان پر آ گئے۔ فلمی دنیا میں ایسی قسم کھانے اور پھر نبھانے کی اس طرح کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

جناب رامانند ساگر کو اردو دنیا والے ایک اخبار نویس، افسانہ نگار، فلم ساز، ہدایت کار اور ٹی وی سیریلز 'رامائن' 'الف لیلیٰ' کے خالق کی حیثیت سے جانتے ہیں، لیکن یہ بات لوگوں کو معلوم نہیں کہ ایک زمانے میں وہ فلم ہیرو بھی بن گئے تھے۔ حصول آزادی سے قبل لاہور کے مشہور پروڈیوسر اور ڈائرکٹر روپ کے شوری نے انھیں اپنی ایک فلم کے لیے بطور ہیرو سائن کیا تھا۔ فلم ایک تہائی بن گئی تو اچانک ہیروئن بیمار پڑ گئی اور چارپائی سے اُس کا ایسا رشتہ جڑا کہ صحت یاب نہ ہو سکی، چناں چہ فلم نامکمل رہ گئی اور شوری صاحب نے دوسرے اداکاروں کو لے کر اپنی نئی فلم کا آغاز کر دیا۔ ساگر نے لاہور کی دیگر فلم کمپنیوں سے رجوع کیا مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی اور کوئی دوسری فلم ہاتھ نہ لگ سکی۔

اداکاری سے دل برداشتہ ہو کر انھوں نے اپنے افسانہ نگار دوست کرشن

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

# محمد علی صدیقی سے اطہر فاروقی کی گفتگو

(دوسری اور آخری قسط)

سوال: کیا آپ کے یہاں اردو کے اعلا تدریسی نصاب میں ہندی کا کوئی لازمی پرچہ ہے کیوں کہ اس کے بغیر اردو ادب کے مزاج سے صحیح واقفیت نہیں ہو سکتی۔ ہندی جانے بغیر ہندستان کے جدید اردو ادب کو بھی نہیں سمجھا جا سکتا۔ ہندی کا جدید ادب خصوصاً افسانوی ادب اردو ادب کے شائقین کی خصوصی دلچسپی کا موضوع ہو سکتا ہے؟

جواب: ہمارے ہاں ابھی ایسی صورت حال نہیں ہے کہ ہندی پڑھائی جا سکے۔ ہم کلاسیکی ادب کو پڑھتے تو ہیں مگر اردو رسم خط کے ذریعے۔ اردو کے تمام کلاسیکل متون فارسی رسم خط میں ہی ملتے ہیں۔ مثلاً رانی کیتکی کی کہانی اردو میں ہی لکھی گئی تھی اور اردو میں ہی پڑھائی جاتی ہے۔ رامائن اور مہابھارت سمیت شاید ہی کوئی ایسا متن ہو جو اردو رسم خط میں موجود نہ ہو۔ ہماری آبادی کا بڑا حصہ ہندی بھلے ہی نہ پڑھ سکے مگر سمجھ ضرور سکتا ہے۔ ہمارے یہاں ہندی پڑھانے کا باقاعدہ کوئی انتظام نہیں ہے اور نہ ہی یہ کوئی لازمی پرچہ ہے۔ لیکن اگر ہندی کی تدریس کا انتظام ہو جائے تو یہ بڑی مبارک بات ہوگی۔ ہندستان میں صورت حال دوسری ہے جہاں اردو اور ہندی دونوں قومی زبانیں ہیں۔ ہندستانی آئین کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے کسی زبان کے لیے قومی زبان کا لفظ استعمال ہی نہیں کیا اور آٹھویں جدول میں شامل تمام زبانیں قومی زبانیں ہیں۔ ہندی کو Official Language of the Union کہا گیا ہے جس میں ابہام کی گنجائش نہیں رہی۔ آپ کے یہاں خالص اردو اور ہندی کے علاقے الگ الگ نہیں۔ جہاں ہندی بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہیں اردو بھی بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے اور آپ کے یہاں یہ بات ناممکن ہے کہ آج کا کوئی نوجوان ہندی نہ جانتا ہو۔ اس سے ادب کے طلبہ کا ذہنی افق یقیناً وسیع اور کشادہ ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں ہندی بہ حیثیت مضمون ابتدا ہی سے نہیں ہے۔ ہمارے یہاں ہندو حضرات میں ایسے لاکھوں نوجوان ہو سکتے تھے جو ہندی تعلیم کا مطالبہ کرتے اور یوں ہندی ملک بھر میں پھیل جاتی مگر چوں کہ بیشتر ہندوؤں کی مادری زبان سندھی ہے اور سندھی کو وہ تمام سہولیات میسر ہیں جس کی عدم دستیابی تشویش کا باعث بن سکتی تھی۔ اسی سبب سے ہندی کے امکانات تقریباً ختم ہو گئے۔ میں خود اس کا حامی ہوں کہ اگر ایم اے میں ہندی کا ایک لازمی پرچہ ہوتا تو اس سے بہت فائدہ ہو سکتا تھا مگر چوں کہ یہ مطالبہ ہی نہیں ہے یوں ہندی بھی نہیں ہے۔ ہاں اعلا امتحانات میں ایک پرچہ سو نمبر کا ہوتا ہے جس میں آپ منجملہ دوسری زبانوں کے ہندی کو بھی بہ حیثیت مضمون لے سکتے ہیں۔

سوال: آپ کے یہاں شاعری اور ادب میں کون سے نئے رجحانات آج کل قابل ذکر ہیں؟

جواب: ہمارے یہاں ایک رجحان تو وہ تھا جو قیام پاکستان کے نتیجے میں ہونے والے فسادات سے یعنی فسادات کے خلاف تخلیق ہوا۔ پاکستانی ادب کا بنیادی مزاج روحانی اور انسانی دوستی پرمبنی ہے۔ روحانی اقدار کے لیے تو گنجائشیں بہت زیادہ ہیں۔ اردو کے مزاج کا تصوف کے ساتھ تعلق بہت گہرا اور قدیم ہے۔ یہی متصوفانہ رجحانات ترقی پسند ادب کا حصہ رہے جس میں انسان دوستی، امن و آشتی اور مساوات پر خاصا زور تھا۔ تقسیم کے فوراً بعد ادب میں اقدار کی شکست و ریخت، ماضی مرحوم کا نوحہ، ہجرت کے تلخ تجربات کی ترجمانی کثرت سے ملتی ہے۔ اس وقت بیشتر بڑے شاعر ہجرت کر کے نئے علاقوں میں آباد ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ان کے ماضی کی یادیں ان سے کبھی جدا نہ ہونے والا سایہ بنی ہوئی تھیں۔

۱۹۵۸ء میں پاکستانی ادب کا دوسرا رجحان پہلا مارشل لا لگنے کے بعد اپنی آواز کو دبانے کی کوششوں کے

خلاف اور ظلم و جبر سے سابقہ پڑنے پر سامنے آیا۔ اس وقت چوں کہ کھل کر مخالفت کرنا ممکن نہ تھا یوں یہ رجحان دروں بینی کا رجحان بن گیا۔ اشاروں، کنایوں اور علامتوں کے سہارے اپنی باتیں کہی جانے لگیں۔ شاید یہی سبب تھا کہ تمام جدید لوگوں نے ترقی پسندانہ موضوعات پر لکھنا شروع کیا۔ براہ راست ادب جبر وقت کے ابتدائی زمانے میں ذرا مشکل ہی سے تخلیق ہوتا ہے۔ عالمی ادب میں ایسی متعدد مثالیں ملیں گی جہاں براہ راست ادب جمہوری دور میں تخلیق ہوا اور جمہوری اقتدار کی پامالی نے علامت نگاری کے رجحان کو فروغ دیا۔ آپ کے یہاں اٹھارہ مہینے کی ایمرجنسی کے علاوہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس وقت بھی آپ کے یہاں حکومت کے خلاف خاصی صدائے احتجاج بلند کی گئی۔ ۱۹۵۸ء کے بعد ہمارے یہاں نئے لکھنے والوں کے کلام میں تہہ داری بڑھی اور یہی جدید ادب کی بنیاد تھی۔ اس زمانے میں بھی بہت سی تبدیلیاں آگئیں۔ مواد بھی مختلف آنے لگے اور داخلیت پسندی زیادہ آگئی۔ اس خارجی صورت حال کے نتیجے میں جو انتشار بطون ذات کی طرف مراجعت کے جس طاقتور رجحان کی شکل میں فروغ پذیر ہوا، اس کے اظہار کی بہترین مثالیں ہمارے اس دور کے ادب میں ہیں۔ اس وقت لکھنے والا خود کو صرف اپنے تئیں ہی جواب دہ محسوس نہیں کرتا تھا۔ سماج پر جو ظلم ہو رہا تھا تخلیق کار کی علامتیں اسی سے عبارت تھیں۔ ہمارے یہاں بعض ایسے لکھنے والے بھی ہیں، ادب جن کے لیے صرف بطون ذات کے اظہار کا معاملہ تھا، مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس لیے ہمارے بیشتر نئے لکھنے والے ترقی پسند ہیں۔ یہ بات آپ کے یہاں کے پس منظر میں لوگوں کو عجیب لگے گی کیوں کہ ہندوستان کے حالات کو ذہن میں رکھ کر پاکستان کے ادب سے متعلق بہت سے مفروضے قائم کیے گئے ہیں۔ ہمارے یہاں جدیدیت صرف مارشل لا کے دور جبر وقت میں پیدا ہوئی اور اس میں ترقی پسندانہ رجحانات کا غلبہ بالکل فطری بات تھا۔ مارشل لا بھی ہمارے یہاں تین بار نافذ ہوا اور ہر بار اس کے اثرات میں وہی تکرار رہی جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ہمارے اٹھائیس سال مارشل لا کے خوف کے سائے میں گزرے ہیں اور ان اٹھائیس برسوں کا ہمارا ادب بے حد علامتی ہے۔ ہمارے یہاں ادب سماجی صورت حال کا معروضی رد عمل ہے، صرف اظہار ذات اور بطون ذات نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "میں، ہم" میں تبدیل ہوتا ہے جب کہ آپ کے یہاں جدید شاعری میں یہ 'میں'، 'میں' ہی رہتا ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ آپ کے ملک کی سیاسی و سماجی صورت حال ہے۔

ہمارے یہاں سندھی ادبی سنگت موجود ہے، سرائیکی ادبی سنگت بھی فعال اور متحرک ہے۔ ہر زبان کی ترقی پسند تنظیم قائم ہے اور اپنی زبان کی بقا اور اس کے ادب کی ترقی کے لیے فعال اور سرگرم ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس زبان کے ادیب اپنے ثقافتی گروپ کے جائز مطالبات کے لیے آواز بلند نہیں کرتے اور اپنی آسائشوں کو داؤ پر نہیں لگاتے، اس زبان کے ساتھ وہ ناانصافی کرتے ہیں۔ اور یہ ناانصافی ہمارے، آپ کے، ہر دو ممالک کے ادیبوں کی ہے۔

سوال: پاکستان میں اردو زبان کی موجودہ ادبی روایت ہندوستان سے بہت مختلف ہے۔ ہندوستان میں چھوٹے قصبات و مضافات نے اردو سلاسک کی ترتیب میں جو تاریخی رول ادا کیا ہے اور کچھ حد تک اب بھی کر رہے ہیں وہ روایت پاکستان میں تقسیم کے سبب اپنا تسلسل برقرار نہیں رکھ سکی۔ خود آپ کا تعلق بھی یوپی کی ایک ایسی ہی تاریخی بستی سے ہے۔ اس پس منظر میں کیا آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ ہندوستان کی نئی نسل اردو زبان پر پاکستان کی نئی نسل سے زیادہ عبور رکھتی ہے؟

جواب: بھائی، یہ بحث بہت طویل ہے اور میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہندوستان میں اردو داں اس نسل کا ذہنی افق ہماری اس نسل سے کہیں زیادہ وسیع ہے جس کا تعلق یوپی کے چھوٹے قصبات سے ہے کیوں کہ انھیں اردو ادب کی روایت کا عرفان ہماری نئی نسل سے زیادہ ہے۔ مگر اب یوپی میں ہی اردو کے حالات سب سے خراب ہیں۔

پاکستان میں اردو بولنے والوں کی تعداد ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۰ فیصد ہے۔ ۱۹۹۱ء میں ہر چند کہ زبان کا خانہ مردم شماری کے خانوں سے خارج ہو چکا ہے مگر ۱۹۶۱ء کی ہی شرح کے حوالے سے یہ تعداد دس فیصد سے کم کسی طور نہیں ہے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد مشرقی پاکستان سے اردو بولنے والوں کی آمد اور سندھ اور پنجاب کے اندرونی علاقوں سے سندھ کے شہروں میں آباد ہو جانے والوں کی ایک بڑی تعداد کی پہلی زبان اردو ہے۔ گجراتی بولنے والے خاندانوں کے بیشتر بچے اب بھی اردو پہلی زبان کے طور پر پڑھتے ہیں اور یہی زبان بولتے بھی ہیں۔ پنجاب میں بھی یہی صورت حال ہے۔ اگر ہم مادری زبان کے ساتھ پہلی زبان کے طور پر بولنے والوں کی تعداد کا تخمینہ لگائیں تو شاید اردو بولنے والے ملک کی تیسری بڑی آبادی قرار پائیں۔ بقول آپ کے اردو پاکستان میں اپنے روایتی مراکز سے دور ہے لیکن اب لاہور، کراچی اور پشاور میں اردو کے نئے مراکز ہیں اور ان مراکز سے جس اردو کو استناد مل رہا ہے وہ یقینی طور پر ہندوستان میں لکھی جانے والی اردو سے قدرے مختلف ہوگی، لیکن بہت زیادہ نہیں۔ مگر یہ عمل فطری ہے جس پر کوئی قدغن نہیں لگائی جا سکتی، لگانی بھی نہیں چاہیے۔ آپ کے یہاں بھی اب حیدرآباد اور جنوب کی دوسری ریاستیں اردو کے نئے مراکز ہیں اور اس حوالے سے اردو میں ہر سطح پر تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ زبان کے بدلتے لسانی رویوں کا تجزیہ ماہرین لسانیات ہی کر سکتے ہیں۔ مگر یہ قطعی ضروری نہیں کہ ان کے اخذ کردہ نتیجے منطقی طور پر ہمیشہ درست ہوں اور ایسی صورت میں وہ تجزیے اہل ذوق کی حد تک بہت زیادہ موثر نہیں ہو پاتے۔

سوال: ہندوستان میں ادب کے موجودہ منظرنامے پر آپ کا تبصرہ کیا ہے؟

جواب: ہندوستان میں اردو ادب خاصا متنوع ہے۔ کلاسیکی اور جدید مکاتب فکر میں بلا کی آویزش ہے۔ لیکن یہ ادب اردو بولنے والوں کے نظام اقدار، تصور وقت اور تصور کائنات سے بہت زیادہ الگ تھلگ بھی نہیں رہ سکتا۔ ہندوستان میں یاسیت پسندی کا فروغ پانا وہاں کے اردو بولنے والوں کی سائیکی کا عکاس ہے۔ جب اردو اور اردو بولنے والے ہندوستانی سماج کے تحرک کو اپنے مزاج کا حصہ بنالیں گے تو فرقہ پرستی کا آسیب اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ اردو ادب ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ادب کی طرح عالمی معیار کا ادب بن سکے گا۔ سردست ہندوستان کا اردو ادب اپنے باطن میں بڑا یاسیت پسند ہے اور وہاں کا ادیب گومگو کی صورت حال سے دوچار نظر آ رہا ہے۔

سوال: ہندوستان سے ہجرت کرکے ایسے پاکستانی ادیب کے طور پر ہندوستان میں اردو کے مستقبل کا تجزیہ کس طرح کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو کا مستقبل؟

جواب: اردو کا مستقبل حکومت کے رویے اور اس رویے کی بابت اردو بولنے والوں کے تجزیے پر منحصر ہے۔ اردو بہ حیثیت ایک زبان محفوظ ہے، یہ بہت سخت جان زبان ہے۔ انگریزی کی اجارہ داری کے بعد اب یہ بات طے ہے کہ جب تک زبانیں روزگار کے مواقع کے ساتھ مربوط نہیں ہو جاتیں، اس وقت تک ان کی تحصیل اور افزائش نہیں ہوتی۔

لیکن میں اردو کے بہی خواہوں کی کوششوں سے مایوس نہیں ہوں اور بالآخر یہ تاریخی تصور سرفراز ہوگا کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ کلچر کی سب سے طاقت ور علامت ہے اور یہ امر کہ سیاسی حالات کے سبب یہ زبان اب مسلمانوں کی نسبتاً تہذیبی اور مذہبی ضروریات زیادہ پوری کرتی رہی ہے، وجہ نزاع نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان شعرا بشمول میر، مصحفی اور غالب اردو زبان کو ہندی ہی کہتے رہے۔ اردو بولنے والوں کو بھی اپنی زبان سے پیار کرنا چاہیے اور دوسری زبان سے اخذ و اکتساب کے لیے تیار رہنا چاہیے کیوں کہ یہ ہندوستانی سماج کا تاریخی تقاضہ ہے۔

سوال: ہندوستان میں وہ نسل جسے پاکستان سے ایک جذباتی وابستگی تھی، رخت سفر باندھ رہی ہے۔ اس نسل کے مکمل خاتمے کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ادبی اور جذباتی تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟

جواب: ایک نسل رخت سفر باندھتی ہے تو دوسری نسل اس کی جگہ لیتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ بدقسمتی سے ان دو ممالک کے باہمی تعلقات دونوں ہی ممالک کی سیاسی قیادتوں کی ترجیحات سے متعین ہوتے ہیں۔ اگر جذباتی وابستگی رکھنے والی نسل کی جگہ آنے والی نسل کے مسائل کے ادراک میں زیادہ سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا گیا اور اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا کہ دوستی صرف نعرہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ثابت ہوتی ہے جو باہمی تعلقات سے پیدا ہوتی ہے۔ دونوں ممالک کی قیادتوں نے ایک دوسرے سے اختلافات کو اب تک قائم رکھا مگر اب انھیں اپنی حماقتوں کا احساس ہو رہا ہے اور دونوں ممالک کے تعلقات بہتر ہو رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہم مختلف سیاسی، جغرافیائی تناظروں اور معاشی مواقع کے ذریعے کس حد تک خوش گوار ماحول پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر دونوں ممالک نے باہمی رنجشوں کو آنے والی نسل کے حوالے کیا اور خود وقت کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہے تو پھر نتیجہ ظاہر ہی ہے۔ روس اور امریکہ کے تعلقات میں بہتری سے یہ خیال جاں گزیں ہوتا ہے کہ شاید ہمارے دونوں ممالک بھی کچھ دو اور کچھ لو کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے آئندہ نسلوں کے لیے زیادہ بہتر مستقبل چھوڑ جائیں گے۔

*****

# اردو دُنیا

## 2000 اردو مترجمین کی تقرری کو منظوری

### تقرری نئے سروس رول کے تحت کی جائے گی

فیروز آباد، یوپی (۱۸رجنوری)۔ دو ہزار اردو مترجمین کی تقرری کے عمل کو ہری جھنڈی دے دی گئی ہے۔ یہ بات آج اخباری نمائندوں کو ریاستی اردو مترجمین ایسوسی ایشن کے سکریٹری مدحت حسین نے بتائی۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت کی جانب سے ۱۳رجنوری ۲۰۱۳ء کو جی او جاری کر دیا گیا ہے۔ تقرری نئے سروس رول کے تحت کی جائے گی جس میں پنشن کا انتظام نہیں ہوگا اور اس کے لیے ضروری لیاقت انٹر میں اردو کا ہونا ہے۔ اترپردیش میں اردو مترجمین کی پہلی تقرری ۱۹۹۴ء میں اشتہار جاری کرا کے کی گئی تھی اور اس کے بعد سے آج تک یہ جگہیں خالی چلی آرہی ہیں۔ اس وقت سے آج تک کسی اردو مترجم کو نہیں رکھا گیا ہے۔ اردو مترجمین کی تقرری جونیئر کلرک کے عہدے پر ہوتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ۲۲رجون ۲۰۱۲ء کو ایک ساتہ ثلاثی میمورنڈم ریاست کے چیف سکریٹری جاوید عثمانی کو دیا گیا تھا جس پر عثمانی صاحب نے پرنسپل سکریٹری پرسنل کو اس سلسلے میں ہدایت جاری کرتے ہوئے کہا تھا کہ ۳۰رستمبر ۲۰۱۲ء تک سبھی مطالبات پورے کرنے کے لیے ضروری کارروائی شروع کر دی جائے۔

حسین صاحب نے بتایا کہ ابھی تک ریاستی حکومت نے اس سلسلے میں کوئی خاطر خواہ پیش قدمی نہیں کی ہے، جس کی وجہ سے اردو مترجمین میں بے اطمینانی پھیل گئی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس ساتہ ثلاثی مطالبے میں اردو مترجمین کی شرح تنخواہ کے علاوہ ان کے پروموشن کا چینل اور سروس رول وغیرہ کے مطالبے شامل ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ۱۹۹۴ء سے آج تک کوئی پروموشن چینل نہیں بنا، اردو مترجمین کو جونیئر کلرک کے طور پر رکھا گیا لیکن جب پروموشن کی بات آئی تو جونیئر کلرک کو تو سینئر کلرک بنا دیا گیا، ان کی تنخواہ 4200 کر دیا گیا، مگر اردو مترجمین کی سینئرٹی کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ اس خبر کے بابت نمائندہ نے فیروز آباد کے محبان اردو سے ملاقات کر کے ان کے تاثرات لیے جس میں اے ایم یعقوبی (جنرل سکریٹری ابو ہریرہ ہائی اسکول) نے کہا کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ صوبائی سرکار اردو والوں کے تئیں سنجیدہ ہے اور آئندہ اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے بنیادی کام کرے گی۔ ہم ریاستی حکومت سے امید کرتے ہیں کہ وہ اردو مترجمین کی طرح اردو اساتذہ کی تقرری میں آنے والی دقتوں کو جلد از جلد دور کرے گی۔

شاعر انور کمال انور نے کہا کہ اردو کو جب تک روزگار سے نہیں جوڑا جائے گا اس وقت تک اردو کا بھلا نہیں ہونے والا ہے، صوبائی حکومت کا یہ لائق ستائش قدم ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

## حیدرآباد میں عالمی اردو کانفرنس منعقد کرنے سے چیف منسٹر کا اتفاق

حیدرآباد (۲رجنوری)۔ سابق وزیر محمد علی شبیر نے آج چیف منسٹر کرن کمار ریڈی سے ملاقات کر کے ان سے سرکاری سطح پر ریاست میں عالمی اردو کانفرنس منعقد کرنے کا مطالبہ کیا اور اس سلسلے میں ایک تحریری یادداشت بھی پیش کی۔ چیف منسٹر کو گاندھی بھون میں پیش کردہ اس یادداشت کے موقع پر صدر پی سی سی بھی موجود تھے اور انھوں نے بھی عالمی اردو کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز کی تائید کی۔ جس پر چیف منسٹر این کرن کمار ریڈی نے محمد علی شبیر کی اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ وہ جلد اس سلسلے میں ایک اجلاس طلب کرتے ہوئے کانفرنس کے لائحہ عمل کو قطعیت دیں گے۔ محمد علی شبیر نے آج گاندھی بھون میں میڈیا کو یہ بات بتائی۔

(منصف۔ حیدرآباد)

## ہائی اسکولوں میں بھی اردو اساتذہ کی تقرری ہوگی

رانچی، جھارکھنڈ (۱۹رجنوری)۔ ریاست کے ہائی اسکولوں میں اب اردو اساتذہ کی بھی تقرری ہوگی۔ محکمہ فروغ انسانی وسائل نے قومی ثانوی تعلیم مہم کے تحت ۱۰۹۴ ہائی اسکولوں میں دیگر علاقائی زبانوں کے علاوہ اردو اساتذہ کی تقرری کی تجویز تیار کی ہے، اس کے تحت ضرورت کے مطابق ہائی اسکولوں میں اردو اساتذہ کی ایک ایک عہدے پر تقرری کی جائے گی۔ تقرری کے لیے تیار ہوئے دستور العمل کو گزشتہ دنوں محکمہ قانون نے اپنی منظوری دے دی اور اب اسے پرسنل ڈپارٹمنٹ کے پاس منظوری کے لیے بھیجا گیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ 338 ریزرو ہائی اسکولوں میں 134 اردو اساتذہ کی تقرری کی کارروائی پہلے ہی کی گئی تھی، ان عہدوں پر تقرری جھارکھنڈ اکیڈمک کونسل کی طرف سے آئندہ سال ۲۹ رمارچ کو مقابلے کے امتحان کے ذریعے ہوگی۔ اس امتحان کے نتائج پہلے سے جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن کی طرف سے منعقد ہونے والے امتحان کے لیے درخواست جمع کرنے والے امیدوار (جو کونسل کے امتحان میں شامل نہیں ہو سکے) کے امتحانات کے بعد جاری کی جائے گی۔ کونسل کی طرف سے جھارکھنڈ ہائی کورٹ کے حکم کے حوالے سے ان امیدواروں کے لیے الگ سے امتحان منعقد کیا جائے گا۔ ادھر پرائمری اسکولوں میں 440 اردو اساتذہ کی تقرری بھی ہونی ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

## مولانا آزاد اردو گرلس ہائی اسکول کی منظوری کے لیے وزیر اقلیتی امور کو میمورنڈم

کلکتہ، مغربی بنگال۔ حکومت مغربی بنگال کے وزیر برائے اقلیتی امور اور مدرسہ تعلیم جناب غیاث الدین ملا کو مغربی بنگال اردو اکادمی میں مولانا آزاد اردو گرلس ہائی اسکول، ٹیا گڑھ کے سکریٹری ماسٹر محمد ٹل جان نے ایک میمورنڈم پیش کیا۔ میمورنڈم میں سکریٹری موصوف نے مطالبہ کیا ہے کہ مدھیامک کلکتہ کینڈر کے تحت اس اسکول کو بھی جلد سے جلد منظوری دی جائے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ اسکول کا ڈسٹرکٹ لیول انسپکٹر کی ٹیم نے گزشتہ ۱۸راگست ۲۰۱۲ء کو انسپکشن کر چکی ہے، تمام کاغذات و دستاویزات پیش کیے جا چکے ہیں۔ منظوری میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے اس کی وجہ سے ٹیچروں میں بے چینی ہے۔ ساتھ ہی سابق وزیر اعلیٰ کے اقلیتی امور کے مشیر خاص سلطان احمد کو بھی میمورنڈم کی کاپی دی گئی ہے، انھوں نے بھی اس پر نظر ثانی کی امید دلائی ہے۔ واضح ہو کہ مولانا آزاد اردو گرلس ہائی اسکول ٹیا گڑھ میں واحد اردو گرلس اسکول ہے، اس اسکول کو منظوری ملنی چاہیے۔

(آزاد ہند۔ کلکتہ)

## دہلی سرکار نے اعلان شدہ 142 اساتذہ میں صرف 55 اساتذہ کا ہی تقرر کیا

نئی دہلی (۱۸رجنوری)۔ دہلی سرکار نے جن 142 اردو اساتذہ کی تقرری کا اعلان کیا تھا ان کی تقرری آج تک مکمل نہیں ہو سکی ہے۔ واضح ہو کہ ہائی کورٹ کے حکم کے بعد دہلی سرکار نے 142 اردو اساتذہ کے تقرر کا اعلان کیا تھا لیکن بعد میں یہ تعداد 142 سے کم کر کے ایک سو کر دی گئی، اس کے باوجود ابھی تک یہ ایک سو تقرریاں بھی عمل میں نہیں آئی ہیں جب کہ موجودہ تعلیمی سیشن اب ختم ہونے کے قریب ہے۔ اس سلسلے میں جب دہلی کی وزیر تعلیم سے بات کی گئی تو ان کا کہنا تھا کہ ان اساتذہ کا تقرر ہو گیا۔ جب انھیں بتایا گیا کہ 100 اساتذہ کا تقرر نہیں بلکہ محض 55 اساتذہ کا تقرر ہوا ہے تو وہ خود حیران رہ گئیں اور کہا کہ میرے علم میں یہ بات نہیں تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس معاملے میں تمام معلومات حاصل کر کے فوری ہدایت جاری کریں گی۔ اس کے علاوہ ابھی تک اردو اکادمی کے تمام اساتذہ کو ہائی کورٹ کے حکم کے مطابق اضافی تنخواہ ادا نہیں کی گئی۔ دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے ایک سوال کے جواب میں روزنامہ راشٹریہ سہارا کو بتایا کہ اردو اکادمی کے تحت 117 اردو اساتذہ پڑھا رہے ہیں، ان میں سے کچھ اساتذہ اپنے معاملے کو لے کر عدالت میں گئے تھے، عدالت کے اس حکم کے بعد کہ ان اساتذہ کو دہلی ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ کے اساتذہ سے نصف تنخواہ ادا کی جائے، انھیں سن ۲۰۰۰ء سے اریر کے ساتھ اضافی تنخواہ ادا کی جا رہی ہے، ان میں سے ٹی جی ٹی اور پی جی ٹی دونوں طرح کے اساتذہ شامل ہیں۔ اس کے تحت ان اساتذہ کو چار سے چھ لاکھ روپے تک اریر بھی ملا ہے۔ یہ رقم ادا کرنے کے لیے ایجوکیشن ڈائرکٹریٹ نے اکادمی کو تین کروڑ روپے بھی ادا کیے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ بات درست ہے کہ ابھی تمام اساتذہ کو یہ سہولت نہیں مل سکی ہے۔ ایسے اساتذہ کی تعداد 34 ہے۔ یہ وہ اساتذہ ہیں جو دوسرے اساتذہ کے ساتھ عدالت نہیں گئے تھے لیکن بعد میں عدالت نے انھیں بھی دوسرے اساتذہ کے برابر اسکیل دینے کی ہدایت دی تھی۔

جب ان کا دھیان اکادمی کے اساتذہ کو کشمیری پناہ گزیں اساتذہ کے برابر اسکیل دیے جانے کے وزیر اعلیٰ کے بیان کی جانب دلایا گیا تو انھوں نے کہا کہ اس پر جلد ہی عمل ہونے والا ہے اور اس سلسلے میں کابینہ نوٹ تیار ہو چکا ہے، اب جلد ہی کابینہ کی منظوری کے بعد اس پر عمل درآمد کر دیا جائے گا۔ واضح ہو کہ وزیر اعلیٰ شیلا دکشت اس معاملے میں گزشتہ کئی ماہ سے اعلان کرتی آرہی ہیں اور ان کے اس بیان سے ایسا تاثر ملتا ہے جیسے سرکار نے اس فیصلے پر عمل کر دیا ہو لیکن ابھی تک اسے کابینہ میں منظوری تک نہیں دی گئی ہے۔ اکادمی کے تحت پڑھانے والے اردو اساتذہ کو عدالت کے حکم کے بعد 17788 (پی جی ٹی) اور 15780 (ٹی جی ٹی) روپے ادا کیے جا رہے ہیں۔ دہلی سرکار کے ذریعے انھیں کشمیری پناہ گزیں اساتذہ کے برابر اسکیل دے دیے جانے کے بعد پی جی ٹی کو تقریباً 22000 اور ٹی جی ٹی کو 20000 روپے ماہانہ مشاہرہ مل سکے گا۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

## میونسپل کارپوریشن کی عمارت پر اردو میں نام تحریر کرنے کا مطالبہ

ناندیڑ، مہاراشٹر (۱۲رجنوری)۔ ناندیڑ واگھالہ شہر میونسپل کارپوریشن کی نو تعمیر شدہ عمارت پر اردو میں نام تحریر کرنے کے مطالبے کو لے کر انڈین یونین مسلم لیگ کے ضلع صدر جناب سید ابراہیم علی نے دفتر میونسپل کارپوریشن کے روبرو اپنی غیر معینہ مدت کی ہڑتال کا آغاز کر دیا ہے، ہڑتال کے پہلے دن مسلم لیگ کے عہدے داروں

## بیجاپور میں اردو اساتذہ کی تقرری نظر انداز

بیجاپور، کرناٹک (۶؍جنوری)، ضلع بیجاپور میں محکمہ تعلیمات عامہ کے زیر اہتمام چلائے جارہے سرکاری پرائمری اسکولوں میں خالی جملہ 345 اسامیوں میں سے 130 اسامیوں کو پُر کرنے کی اجازت ملی ہے جس میں ایک بھی اردو ٹیچر کی اسامی خالی نہیں ہے۔ اس ضمن میں نامہ نگار 'سالار' نے ڈی ڈی پی آئی جناب بی این حکیم سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے واضح طور پر بتایا کہ موجودہ اردو ٹیچرس کو بھی ورک بوجھ نہ ہونے کے سبب انھیں افزود ٹیچرس قرار دے کر ان کے تبادلے کیے جارہے ہیں۔ ایسے حالات میں نئے اردو اساتذہ کی تقرری دور کی بات ہے۔ انھوں نے مزید بتایا کہ دن بہ دن ضلع کے موجودہ اردو اسکولوں میں اردو طلبہ کی تعداد میں کمی ہورہی ہے اور نئے ٹیچرس کی تقرری بچوں کی تعداد میں اضافے کے بعد ہوگی۔ حکیم صاحب نے سابق ضلع پنچایت بیجاپور کے اجلاس میں ڈیپوٹیشن پر ٹیچرس کے تبادلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ضلع میں یکم جنوری سے ڈیپوٹیشن پر پابندی عائد کی گئی ہے جب کہ اب تک 59 ٹیچرس کا ڈیپوٹیشن منسوخ کیا گیا ہے۔

(سالار۔ بنگلور)

## گلیوں کے بورڈوں پر اردو میں علاقے کا نام نہ لکھنے سے لوگ ناراض

نئی دہلی (۲۸؍دسمبر)۔ ماجد حالی کی شاہراہوں کے علاوہ پرانی و نئی دہلی کے مسلم اکثریتی علاقوں کی گلیوں کے کھمبوں پر علاقے کا نام اور گلی نمبر کے بورڈ ہندی اور اردو میں آویزاں کیے جاتے ہیں، لیکن جمنا پار کے مسلم اکثریتی علاقوں میں گلیوں کے بورڈوں پر ہندی کے ساتھ اردو کا استعمال نہ ہونے سے نمایاں اردو عوامی نمائندوں سے ناراض ہیں۔ نمائندہ 'راشٹریہ سہارا' نے میونسپل کارپوریشن کے وارڈ چوہان بانگر، جعفرآباد، عثمان پور، بھجن پورہ، سبھاش محلہ، جمنا کالونی، کبیر نگر، کردم پوری، مصطفیٰ آباد، نہرو وہار، کراول نگر، گھونڈا وارڈ کی گلیوں کے بورڈوں کے تعلق سے پتا کیا تو معلوم ہوا کہ ان مقامات کی گلی نمبر کے بورڈوں پر صرف ہندی میں علاقے کا نام درج ہے، جب کہ یہاں دو مسلم ایم ایل اے سیلم پور سے چودھری متین احمد اور مصطفیٰ آباد سے حسن احمد اور 6 کونسلروں میں شکیلہ بیگم (جعفرآباد وارڈ)، اسماء رحمٰن (چوہان بانگر وارڈ)، ڈاکٹر حسین خان (جمنا کالونی وارڈ)، پروین معروف (مصطفیٰ آباد وارڈ)، حاجی تاج محمد (نہرو وہار وارڈ) اور حاجی آس محمد (گھونڈا وارڈ) سے کونسلر ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے اپنے وارڈوں میں گلیوں کے بورڈوں پر ہندی کے ساتھ اردو لکھوانے کی زحمت نہیں کی، جس سے مذکورہ نمائندوں کے خلاف مقامی لوگوں میں غم و غصہ ہے۔

جعفرآباد آر ڈبلیو اے کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر فہیم بیگ کا کہنا ہے کہ شاید مقامی نمائندے اردو کے تئیں سنجیدہ نہیں ہیں، اسی لیے انھوں نے ہندی کے ساتھ اردو کو ترجیح نہیں دی۔ سماجی کارکن ڈاکٹر سیما کا کہنا ہے کہ گزشتہ دنوں گلیوں کے بورڈ سے مقامی ایم ایل اے کا نام ہٹا کر ان پر ایم سی ڈی علاقہ و گلی نمبر ہندی میں لکھوایا گیا ہے، اگر ان کونسلروں کو اردو سے ذرا برابر انسیت ہوتی تو ضرور اردو زبان کا استعمال کیا جاتا۔ سیلم پور میں واقع اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے ڈاکٹر سید احمد نے بتایا کہ الٰہ آباد کے ڈپٹی ایم راج شیکھر کے آفس پر آویزاں نام پلیٹ پر راج شیکھر کے بجائے راج شکار لکھا تھا جس کی خبر 'راشٹریہ سہارا' میں آئی اور اردو والوں کے احتجاج کے بعد 24 گھنٹے کے اندر نام کو ٹھیک کرایا گیا جس سے مسلم علاقوں کے عوامی نمائندوں کو سبق لینے کی ضرورت ہے اور ہر ممکن اردو کی ترویج و ترقی کے لیے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہے۔ حالاں کہ بعض کونسلروں نے اپنا نام اردو میں لکھوائے ہیں۔ علاوہ خدمت گار کمیٹی کے صدر جناب حاجی محبوب الٰہی اور جنرل سکریٹری جناب عبدالعلیم برنی کا کہنا ہے کہ انھوں نے دو برس قبل تنظیم کے تحت گلیوں کے نکڑ پر بورڈ لگانے کے لیے جدوجہد کی تھی تاکہ گلیوں اور مکانوں کے نمبر بورڈ پر لکھنے میں آسانی ہوسکے۔ انھوں نے بتایا کہ جدوجہد کے نتیجے میں جمنا پار ترقیاتی بورڈ سے گلیوں کے بورڈ حاصل ہوئے اور 90 بورڈ علاوہ خدمت گار کمیٹی کے تحت نصب کیے گئے جن پر ہندی کے ساتھ اردو رسم الخط کا بھی استعمال کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح پرانی دہلی و نئی دہلی کے مسلم علاقوں کی گلیوں کے بورڈوں پر اردو کا استعمال کیا گیا ہے، اسی طرح جمنا پار کے مسلم اکثریتی علاقوں میں بھی ہونا چاہیے لیکن یہ تب ہی ممکن ہے جب عوامی نمائندے ہندی کے ساتھ اردو کے استعمال کو ترجیح دیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

نانڈیڑ میں بھی اسی نوعیت کا معاملہ ... کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگوں نے اس مطالبے کی پُرزور تائید و حمایت کرتے ہوئے یکسوئی کا مطالبہ کیا۔ اس موقعے پر نانڈیڑ کے معروف سماجی کارکن اور مسلم لیگ کے مراٹھواڑہ کنوینر جناب الطاف احمد اور دوسرے موجود تھے۔ واضح رہے کہ نانڈیڑ واگھالہ شہر میونسپل کارپوریشن کی نو تعمیر شدہ عمارت کے افتتاح سے قبل صدر مسلم لیگ سید ابراہیم علی ابو نے ۲۲؍اپریل ۲۰۱۱ء اور ۳؍مئی ۲۰۱۱ء کو اردو میں نام تحریر کرنے کا مطالبہ کیا تھا، لیکن میونسپل انتظامیہ نے ٹال مٹول کا رویہ اپنایا تھا۔ سید ابراہیم علی ابو نے مورخہ ۳۱؍دسمبر ۲۰۱۲ء کو میونسپل کمشنر اور میئر کو یادداشت پیش کرکے اپنے مطالبے کا اعادہ کیا تھا، لیکن میونسپل انتظامیہ نے ریاستی حکومت کے مختلف جی آر کا حوالہ دیتے ہوئے اس مطالبے کو دوبارہ نظرانداز کرنے کی پالیسی اختیار کی ہے چوں کہ میونسپل کارپوریشن نانڈیڑ کا شمار مقامی ادارہ جات میں ہوتا ہے اس لیے اردو میں نام تحریر کرنے کے لیے ریاستی حکومت کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

## کامل بہزادی کی کتاب 'عبارت' کی رسم اجرا اور مشاعرہ

بھوپال (ڈاک سے)۔ پچھلے دنوں سیہور (مدھیہ پردیش) میں آل انڈیا اردو رابطہ کمیٹی اور ساجد گارڈن پولیس کے زیر اہتمام ایک آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا گیا جس میں اردو کے معروف شاعر جناب کامل بہزادی کے شعری مجموعے 'عبارت' کی رسم اجرا عزت مآب جناب عزیز قریشی (گورنر اتراکھنڈ) کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر اردو ہندی کے مشہور قلم کار جناب اوم پرکاش نے کامل بہزادی کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالی۔ بعد ازاں گورنر موصوف جناب عزیز قریشی نے کامل بہزادی کے چند پسندیدہ اشعار سنائے جسے سامعین نے داد و تحسین سے نوازا۔

رسم اجرا کے بعد آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت جناب ظفر صہبائی نے فرمائی اور نظامت کے فرائض انجم بارہ بنکوی نے انجام دیے۔ اس مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان کے اسمائے گرامی ہیں: ظفر صہبائی، کامل بہزادی، افضل منگلوری، ڈاکٹر یونس فرحت، انجم بارہ بنکوی، ہاشمی ملک نوید، کہکشاں بلرام پوری، اوم پرکاش، ریاض احمد ریاض، احسان وارثی، اطہر سعد، میر بیگ، سلیم دانش اور یحییٰ الحسن ساگر وغیرہ۔

(مظفر طالب)

## اک دیا اور بجھا

لکھنؤ: مشہور و ممتاز شاعر و ادیب اور محقق پروفیسر ولی الحق انصاری کا ۲۸؍جنوری ۲۰۱۳ء کو دوپہر تقریباً دو بجے ان کے آبائی مکان دارالامان فرنگی محل میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 88 برس تھی۔ مرحوم لکھنؤ یونیورسٹی میں شعبۂ فارسی کے صدر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے تھے۔ انھوں نے اردو، فارسی اور انگریزی میں ایک درجن سے زائد کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ 'کلیات عرفی' ان کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جسے تہران یونیورسٹی نے تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ ان کی دیگر اہم تصانیف میں 'شعلۂ ادراک'، 'غزالان خیال'، 'فروغ فصل گل'، 'نقوش زیبا'، 'کہکشاں'، 'عروس گل' اور 'شب چراغ' قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر ولی الحق انصاری کو فارسی زبان و ادب میں ان کی عظیم خدمات کے لیے انھیں صدر جمہوریہ ہند نے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ اس کے علاوہ حکومت ایران نے فارسی ادب میں ان کی خدمات کے لیے سعدی ایوارڈ پیش کیا۔ اترپردیش اردو اکیڈمی نے بھی اردو زبان کی خدمات کے سلسلے میں انھیں اکیڈمی کا سب سے بڑا ایوارڈ پیش کیا تھا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

## منٹو: فن اور شخصیت پر یک روزہ قومی سیمینار

### ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی کتاب 'ڈاکٹر امام اعظم: اجمالی جائزہ' کی رونمائی

کولکاتا (پریس ریلیز)۔ اردو ادب کے عہد ساز ادیب سعادت حسن منٹو کے فن اور شخصیت پر آر این ایل فورس، کولکاتا کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے تعاون سے یک روزہ قومی سیمینار کا اہتمام ۲۰؍جنوری ۲۰۱۳ء کو اکیڈمی آف فائن آرٹس کے کانفرنس ہال میں کیا گیا۔ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے جناب جمیل منظر، محمد امین الدین صدیقی اور ڈاکٹر امام اعظم تشریف فرما تھے۔ کینیڈا سے تشریف لائے معروف ڈراما نگار جاوید دانش نے سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے منٹو کے فن کا مختصر احاطہ کیا۔ پہلا اجلاس پروفیسر شمیم انور (سابق صدر شعبۂ اردو، کلکتہ یونیورسٹی) کی صدارت میں ہوا جس میں کل چار مقالے پڑھے گئے۔ پہلا مقالہ احمد معراج نے 'منٹو ایک عہد ساز افسانہ نگار'، دوسرا مقالہ شاہد اقبال نے 'منٹو بحیثیت ڈراما نگار'، تیسرا مقالہ اور رضا گڑھ سے تشریف لائے مہمان مقالہ نگار ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے 'منٹو کے افسانوں کا اسلوب' اور چوتھا مقالہ شبانہ خاتون ثمن نے 'سعادت حسن منٹو: ایک منفرد افسانہ نگار' کے عنوان سے پیش کیے۔ اجلاس کے اختتام پر ڈاکٹر محمد کاظم نے سعادت حسن منٹو کے فن سے بحث کرتے ہوئے ان کی عصری معنویت پر روشنی ڈالی جب کہ صدر اجلاس پروفیسر شمیم انور نے تمام مقالوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ طعام کے بعد دوسرا اجلاس پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی صدارت میں شروع ہوا۔ مقالہ خوانی سے قبل کلکتہ کے تین معروف صحافیوں کو 'فخر صحافت ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ آر این ایل فورس، کولکاتا کے چیف منسٹری ڈاکٹر نوشاد عالم نے جناب امین الدین صدیقی مدیر روزنامہ 'آزاد ہند' کلکتہ کو، ڈاکٹر امام اعظم نے جناب جمیل منظر مدیر ماہنامہ 'تکمیل' کولکاتا کو جب کہ پروفیسر شمیم انور نے جناب محمد ندیم الحق مدیر روزنامہ 'اخبار مشرق' کے غائبانے میں ان کا ایوارڈ اخبار مشرق سے وابستہ جناب سرفراز احمد کو پیش کیا۔ یہ ایوارڈ ایک سپاس نامے، شال اور مومنٹو پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد مقالہ خوانی کا دور شروع ہوا جس میں پہلا مقالہ ڈاکٹر حسین احمد زاہدی نے 'منٹو کے افسانے' پر کا تنقیدی جائزہ'، دوسرا مقالہ ڈاکٹر نصرت جہاں نے 'منٹو: جدید افسانہ نگاری کا پیش رو'، تیسرا مقالہ ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی نے 'ریڈیائی ڈراما، منٹو اور ٹیلی ویژن'، چوتھا مقالہ ڈاکٹر محمد کاظم نے 'منٹو کے افسانوں کے کردار ڈراما نگار کی نظر میں' اور پانچواں اور آخری مقالہ ڈاکٹر امام اعظم نے 'منٹو

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

# نئی کتابیں

تبصرے کے لیے
دو کتابوں کا
آنا ضروری ہے

نام کتاب : احسن خاندان اور علی نگر پالی
مصنف : قمر امام
ضخامت : ۱۹۰ صفحات
قیمت : ۱۳۰ روپے
ملنے کا پتا : حسینی سماج، پالی کالونی پٹنہ-۸
تبصرہ نگار : ڈاکٹر سید معصوم رضا عشروی

اردو میں قمر امام کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ انھوں نے گزشتہ دہائی میں کئی تصانیف منظر عام پر لاکر کئی نسل دیگر کو اردو ادب کے قارئین سے متعارف کرایا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب 'احسن خاندان اور علی نگر پالی' بھی اسی سلسلے کی ایک اہم اور تازہ ترین کڑی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کتاب اردو ادب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ یہ خالص سوانحی حیثیت کی کتاب ہے، اس کتاب میں شامل مواد میں ۴۴ صفحات پر مشتمل سید اسماعیل احسن کا سوانحی خاکہ اس کی منھ بولتی دلیل ہے۔ بہرحال قمر امام بسیار نویس ہیں اور انھیں تلاش و تحقیق کے فن میں مہارت حاصل ہے اور اسی وجہ سے وہ نہ صرف اپنے قرب و جوار یا آبائی وطن علی نگر پالی کے حوالے سے کوئی نہ کوئی تحقیق کرتے رہتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب علی نگر پالی کے چند خاندانوں میں سے ایک خاندان احسن خاندان سے متعلق ہے جس میں قمر امام نے 'میں نے یہ کتاب کیوں لکھی' اور پیش لفظ کے علاوہ نو ذیلی عنوانات کے تحت خاندان احسن کے چشم و چراغ ڈاکٹر سید اسماعیل احسن کا تفصیلی ذکر کیا ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ ضمنی طور پر انھوں نے ان کے آبا و اجداد اور خاندانی وراثت کے ساتھ ساتھ ان کے بھائی ڈاکٹر سید نذر احسن اور برادر نسبتی ڈاکٹر نذر امام کا بھی ذکر کیا ہے۔ علی نگر پالی سے وابستگی سید اظہار حسین حنیظ صاحب کی شادی سے ہوئی اور رفتہ رفتہ انہی کا خاندان پالی میں احسن خاندان کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ سید اظہار حسین حنیظ صاحب کے بیٹے سید ذوالفقار احسن صاحب پھر ان کے تین بیٹوں میں دو بیٹے ڈاکٹر سید نذر احسن اور ڈاکٹر سید اسماعیل احسن کا تذکرہ ہی خاندان احسن کے حوالے سے تفصیل سے کیا گیا ہے اس کے علاوہ حنیظ صاحب کے دیگر بیٹوں کا ذکر سرسری طور پر اس کتاب میں موجود ہے۔ اس خاندان کے حوالے سے قمر امام کا تاثراتی بیان ملاحظہ فرمائیں:

''اس وقت اگر یہ بات کہوں کہ بہار کی سرزمین پر پالی کا واحد خاندان جناب سید اظہار حسین حنیظ صاحب کا ہے جو علم و فضل میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ علم کی دنیا میں اس خاندان کا جو فرد جہاں بھی ہے ممتاز اور بلند نظر آتا ہے''۔

اس کے بعد جو باب ذیلی عنوان 'پٹنہ یونیورسٹی اور علی نگر پالی' کے حوالے سے شامل ہے جس میں سرسری طور پر پٹنہ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر سر سلطان احمد کا ذکر ہے اور اسی ضمن میں سید نذر احسن کا بھی ذکر پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے طور پر کیا گیا ہے لیکن قدرے تفصیل سے پرو وائس چانسلر ڈاکٹر اسماعیل احسن کا ذکر موجود ہے۔ کتاب کے چھٹے ذیلی باب میں ڈاکٹر سید نذر احسن کی شخصیت، سیرت، تعلیمی صلاحیت، تصانیف، تخلیقات، تحقیقات اور تجربات کا قدرے تفصیل سے ذکر موجود ہے۔ آخر میں ڈاکٹر نذر احسن کے بیٹے اور بیٹیوں کا سرسری ذکر اور انتقال کا بھی ذکر ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر سید اسماعیل احسن کے سائنسی علوم اور انجینئرنگ سروس سے متعلق تمام سوانحی کوائف کو مصنف نے حرف بہ حرف اردو اور انگریزی میں پیش کیا ہے جس کا تعلق بظاہر تو اسماعیل احسن کے تعلیمی سفر اور پیشہ ورانہ تجربات سے ہے جس سے صرف ٹیکنالوجی کی تعلیم حاصل کرنے والے حضرات ہی دل چسپی لے سکتے ہیں۔ آخر میں خاندان احسن کے داماد ڈاکٹر سید نذر امام کا ذکر ہے جو آئی سرجن کے ساتھ ساتھ معروف انشائیہ نگار بھی تھے، ان کا وطن عشری ضلع سیوان تھا اور ان کی تین ادبی تصانیف 'زخم دشنہ'، 'سفرستان' اور 'عشری سے کربلا تک' ہیں۔ ڈاکٹر نذر امام کی شہرت آنکھوں کے ڈاکٹر کی حیثیت سے بھی اتنی تھی جتنی ایک انشائیہ نگار اور ادیب کی حیثیت سے تھی۔ ماہنامہ 'صبح نو' سے ان کی وابستگی اور اُن کے انتقال پر اردو کے ناقدوں اور تجزیوں کے تاثرات کے حوالے سے قدرے تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ قمر امام نے ذرّے کو آفتاب بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے اور قلم کی روانی، تحریر کے جادو اور تخیل کی بلند پروازی سے اس کتاب کے باطن کو ایسا مالا مال کردیا ہے کہ خشک موضوع کے باوجود قاری کا تسلسل برقرار رہتا ہے اور آخر آخر تک تجسس اور انداز بیان کے حصار سے قاری آزاد نہیں ہوپاتا جو صرف اور صرف قمر امام کے جادوئی قلم کا کمال ہے جس نے اس کتاب کو علم و فضل کے کمالات سے منوّر کردیا ہے۔ کتاب اپنے ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہے۔ امید کہ اسے بہار کے خصوصی حلقے میں ضرور پسند کیا جائے گا۔

○○○

نام کتاب : عکس وحدت و رسالت
مصنف : عمران عظیم
ضخامت : ۱۰۴ صفحات
قیمت : ۱۲۰ روپے
ملنے کا پتا : مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامع مسجد، دہلی-۱۱۰۰۰۶
تبصرہ نگار : انور آفاقی

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ۱۴۳۳ھ سے اب تک عرب و عجم کے بے شمار فصیح و بلیغ شعرائے حمد و نعت کے قابل قدر اشعار سے ادب کو مالا مال کیا ہے جب کہ خاک نژاد ظہیرا روح فانی ہے، ہاں اگر یہ خوش عقیدگی اور فکر و دانش کا مرکز بن جائے تو جاودانیت کی اس میں اہلیت ہے کیوں کہ پاکیزہ عقیدتیں، رفعتوں کے آسمانوں کی لامحدودیت نور حق کے جلوے عطا کرتی ہیں۔ حُبِّ رسول اور عشقِ الٰہی کا ہی کرشمہ ہے کہ عمران عظیم نے اسماء اللہ اور اسماء محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دوہوں میں نظم کردیا ہے، وہ بھی اس طرح کہ ترجمے میں اسم کا اصل مفہوم اجاگر ہوگیا ہے۔ زبان بیان شستہ و سلیس اور عام فہم ہے۔

'دوہا' شاعری کی ایک صنف ہے، یہ ہندی سے اردو میں آئی ہے۔ تیرہویں صدی کے صوفی شاعر حضرت امیر خسرو نے دوہوں کی زبردست ترویج و اشاعت کی۔ آپ کے بعد اردو، ہندی، پنجابی میں شعرائے خوب خوب دوہے لکھے ہیں اور اب بھی لکھے جارہے ہیں۔ دوہے میں ہر قسم کے مضامین کی گنجائش ہے، دوہے میں چار چرن اور بحر فعلن فعلن فاعلن ۔ فعلن فعلن فاع تک ہی محدود رکھا جانا ضروری ہے، بہت سوں نے اس کی اصل ہیئت کے خلاف بھی لکھا ہے جس سے دوہے کا فن و ہیئت مجروح ہوا ہے۔ مگر عمران عظیم نے تمام دوہے اس کی اصلی ہیئت اور فن کے ساتھ کہے ہیں جو بڑا مشکل کام تھا۔ دراصل یہ دوہے اللہ و رسولؐ کی بارگاہ میں عمران کا عقیدت مندانہ اظہار ہے۔ اب تک عمران عظیم کی طرز پر کسی نے مسلسل دوہے نہیں کہے وہ بھی حمدیہ و نعتیہ، نہایت ندرت و جدت آمیزی کے ساتھ۔ بلا مبالغہ دوہوں کا یہ مجموعہ 'عکس وحدت و رسالت' بالکل نیا کارنامہ ہے۔

○○○

نام کتاب : گیتوں کے البیلے راج کنور: ساحر شیوی
مرتب : پریم گوپال مِتّل
ضخامت : ۱۹۲ صفحات
قیمت : ۲۵۰ روپے
اشاعت : ۲۰۱۲ء
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹-گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : دیپک بدکی

'گیتوں کے البیلے راج کنور: ساحر شیوی' اردو ادب کو پریم گوپال مِتّل کا ایک اور گراں بہا تحفہ ہے۔ اس سے پہلے بھی انھوں نے کئی کتابوں کی تصنیف، ترجمہ اور تدوین و ترتیب کی ہے۔ ماہنامہ 'تحریک' کی ادارت کے دوران انھوں نے بہت ساری ہندی اور پنجابی کہانیوں کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ زیر نظر کتاب میں تعارفی تحریر کرنے کے علاوہ مرتب نے چند حمدیہ و نعتیہ گیت اور بیس اہلِ قلم حضرات کے تنقیدی و تاثراتی مضامین شامل کیے ہیں جن سے ساحر شیوی کی شخصیت اور ادبی خدمات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب میں تیرہ منظوم خراج تحسین بھی شامل کیے گئے ہیں۔

۲۹ دسمبر ۱۹۳۶ء کو کوکن مہاراشٹر کے ایک چھوٹے سے گاؤں شیو میں پیدا ہوئے عبداللہ نے جب شعر کہنا شروع کیا تو اپنے استاد کے مشورے پر ساحر تخلص رکھ لیا۔ لڑکپن ہی میں تلاش معاش کی خاطر نیروبی (کینیا)، کراچی (پاکستان) اور لندن (UK) کی خاک چھان ماری۔ تاہم ادبی خدمت جاری کو کبھی نہ بھولے جس کا اعتراف نسیم انجم وارثی یوں کرتے ہیں:

''حالاں کہ ساحر عمر کی ڈھلان پر ہیں، شاید زندگی کی اسّی بہاریں دیکھ چکے ہیں، پھر بھی ہر سال کوکن پہنچتے ہیں، ذرّہ ذرّہ کو دیکھتے ہیں، رشتہ داروں اور ملت داروں سے ملتے جاتے ہیں، تقریبات میں شرکت کرتے ہیں... 'کوکن کا گیت' ایک تاریخ ساز گیت ہے جسے اہل کوکن ہمیشہ یاد رکھیں گے۔''

ادبی سرگرمیوں کے علاوہ ساحر کئی سماجی اداروں سے بھی منسلک رہے ہیں اور کئی اداروں نے نہ صرف ان کو اعزازات و انعامات سے نوازا ہے بلکہ پولینڈ یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی ہے۔ اردو کی نئی بستیوں میں مقیم اس قادر الکلام شاعر کے ۱۹ شعری مجموعے اور ۱۰ نثری مجموعے منصہ شہود پر رونما ہوچکے ہیں جب کہ ۷ اور کتابوں کی ترتیب و تالیف بھی کرچکے ہیں۔ ساحر شیوی ماہنامہ 'پرواز' لندن، ماہنامہ 'صدا' لندن، سہ ماہی 'سفیر اردو' UK اور سہ ماہی 'ترسیل' بھارت سے بھی جڑے رہے ہیں۔ انھوں نے اردو کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جیسے حمد، نعت، غزل، نظم (پابند و آزاد)، قصیدے، گیت، قطعے، رباعیاں، دوہے، سہرے، ماہیے، ہائیکو، علاقی، مضامین، تراجم، افسانے اور خاکے وغیرہ مگر گیت ان کی پہچان بن کر رہ گئے ہیں۔ گیتوں میں انھوں نے حمدیہ گیت، نعتیہ گیت، دوہا گیت، برہی گیت، گرجاں (ایک قسم کا سارس جو دو پریمیوں کے بیچ نامہ و پیام لے جاتا ہے) گیت، ماہیا گیت، سہرا گیت، ہندی گیت اور قومی گیت لکھے ہیں۔ ان کے گیتوں کے بارے میں حقّی صدیقی لکھتے ہیں کہ:

''ساحر شیوی کے گیتوں کے بولوں میں بنے سروں کی اثر انگیزی، دلکش لفظوں کی سادگی اور جذبوں کی فراوانی محسوس کی جاسکتی ہے۔''

اسی حوالے سے اسحاق ساجد فرماتے ہیں کہ:

''ساحر شیوی کے سارے گیت محبت، خواب اور شکستہ خواب کے گیت ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میدان کے گیت تو جوانوں ہی میں نہیں بلکہ بزرگوں میں بھی مقبول عام ہونے کی گنجائش رکھتے ہیں... ساحر شیوی کے مجموعہ گیت اپنے کئی روپ رکھتے ہیں، لیکن ان تمام صورتوں میں ان کی سوچ کا محور انسان، انسان دوستی اور

انسانیت کی فضیلت ہے۔''
صورت کلام ملاحظہ ہو:

تنہا تنہا جیتے جیتے
غم کے آنسو پیتے پیتے
میری جوانی تھک سی گئی ہے

محبت کی کوئی بھی منزل نہیں ہے
محبت کا کوئی بھی ساحل نہیں ہے
محبت سے کچھ بھی تو حاصل نہیں ہے
مناسب یہی ہے کہ ہم ترک چاہیں
تمھاری ہماری تو راہیں جدا ہیں

برس برس کر تھم گئی، آنکھوں کی برسات
پلکوں اوپر تھم گئی، اشکوں کی بارات
میں کیا جانوں اے سکھی، ایسی ہوگی پریت
کیسے گاؤں گیت!

بھرتا ہوں میں گھڑی گھڑی
لے کر دیا کل من کی بستی
ناگن جیسی مجھ کو ہے ڈستی
یہ میری ہستی

ساحر کے حمدیہ و نعتیہ گیتوں کے بارے میں امجد مرزا امجد یوں رقم طراز ہیں:
''انھوں نے جہاں نعتیہ گیتوں میں رسول اکرم کی شان کو نہایت سادہ اور خوب صورت الفاظ میں بیان کیا ہے وہاں حمدیہ گیتوں میں اللہ کی شان کو بھی ایسے الفاظ میں بیان کیا ہے کہ پڑھتے ہوئے گنگنانے کو دل کرتا ہے، جو گیت کی اصل روح ہے۔''

البتہ ساحر کی غنائیت اور ترنم کے بارے میں متضاد تاثرات رقم کیے گئے ہیں۔ ایک جانب رضوان علی فرماتی ہیں:
''چوں کہ ساحر شیوی ایک مترنم شاعر نہیں ہیں اور نہ موسیقی سے واقفیت حاصل ہے، اس لیے ان کے بانکے گیتوں میں غنائیت کا فقدان ہے''۔
تو دوسری جانب رفیعہ شبنم رقم طراز ہیں:
''ساحر شیوی کے گیتوں میں مناسب لفظوں کی ترتیب سے جو غنائیت پیدا ہوتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساحر ایک مترنم شاعر ہیں۔''
ظاہر ہے کہ تنقید نگاروں نے اپنی رائے بے لاگ، ولپیٹ دی ہے۔

مجموعی طور پر مذکورہ بالا کتاب ساحر کی شاعری پر منصفانہ روشنی ڈالنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ مشمول مضامین سے ساحر شیوی کی وطن پرستی، مذہبی یکجہتی اور انسان دوستی ابھر کر آتی ہے۔ ترتیب و تزئین بھی خوشنما ہے اور قیمت بھی واجبی ہے۔ امید ہے اردو حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوگی۔

■◆■

## بقیہ: فلمی دنیا میں اردو کی سنہری دور...

چندر کی وساطت سے پونا کی فلم کمپنی شالیمار پکچرز میں بطور پبلسٹی انچارج شمولیت کرلی۔ ڈبلیو زیڈ احمد اس کمپنی کے مالک تھے۔ اداکارہ نینا اُن دنوں ان کی محبوبہ تھی جو انتظامات میں اُن کا ہاتھ بٹاتی تھی (بعد میں ان دونوں نے شادی کرلی تھی)۔ جوش ملیح آبادی، ساغر نظامی پہلے ہی اس کمپنی سے منسلک تھے۔ کرشن چندر شالیمار کے لیے فلم 'من کی جیت' کی کہانی اور مکالمے لکھنے میں لگے ہوئے تھے، جوش اور ساغر گیت لکھنے میں منہمک تھے۔ اختر الایمان فلم 'پرتھوی راج سنجوگتا' کا اسکرپٹ تیار کر رہے تھے۔ بلراج ساہنی اور چیتن آنند بطور رائٹر اس کمپنی میں ملازمت کرنے کے لیے آتے تھے، کرشن چندر نے اُن کی سفارش کی تھی لیکن کم تنخواہ آفر ہونے کی وجہ سے بات نہ بن سکی اور دونوں واپس چلے گئے۔

راما نند ساگر وہاں زیادہ دن نہ ٹک سکے اور لاہور واپس جاکر اخبار 'ملاپ' کے ادارتی عملے میں کام کرنے لگے۔ ملک کا بٹوارہ ہوگیا تو ساگر ہجرت کر کے بمبئی جا پہنچے جہاں انھوں نے فلموں کے لیے کہانیاں لکھنی شروع کردیں۔ آر۔ کے فلمز کے لیے 'برسات' کی کہانی اور مکالمے لکھ کر انھوں نے لافانی شہرت حاصل کی اور ایک ہی جست میں چوٹی کے فلمی مصنف بن گئے۔ اس کے بعد اُن کا ہر قدم کامیابی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ انھوں نے جان پہچان، اک تیری نشانی، بازوبند، مہمان، گیت وغیرہ فلمیں لکھیں، اس کے بعد پروڈیوسر اور ڈائرکٹر بن گئے۔ 'آرزو' (سادھنا، راجندر کمار، فیروز خاں) اُن کی سب سے کامیاب فلم تھی۔ شروع شروع میں اُن کی ہر فلم کسی نہ کسی ہل اسٹیشن سے وابستہ ہوتی تھی کیوں کہ ان کے خیال میں محبت صرف پہاڑوں پر پروان چڑھتی تھی لیکن بعد میں وہ ہر طرح کی فلمیں بنانے لگے۔ انھیں اسٹیج سے گہری دل چسپی تھی۔ وہ کچھ عرصہ پرتھوی تھیٹرز سے وابستہ رہے۔ اردو کے ایک ممتاز مصنف دیدی ساقی برسوں تک فلموں میں ان کے اسسٹنٹ رہے، بعد میں وہ خود پروڈیوسر بن گئے۔ ○○



## بقیہ صفحہ ۵ سے آگے

کے افسانوں کی سماجی معنویت' کے عنوان سے پیش کیا۔ مقالہ خوانی کے فوراً بعد ڈاکٹر ایم صلاح الدین کی کتاب 'ڈاکٹر امام اعظم : اجمالی جائزہ' کی رسم رونمائی جناب جمیل منظر کے ہاتھوں انجام پائی۔ اس کے بعد کتاب ہذا پر شاہد اقبال کے تبصرے کو ان کے غائبانے میں احمد معراج نے پڑھ کر سنایا۔ جناب جمیل منظر نے ڈاکٹر ایم صلاح الدین اور ڈاکٹر امام اعظم کو اس خوب صورت کتاب کی رونمائی پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر امام اعظم کثیر الجہت شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی حیات اور خدمات کو اس کتاب میں ڈاکٹر ایم صلاح الدین نے جس عرق ریزی کے ساتھ جمع کیا، وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ جناب امین الدین صدیقی نے بھی مصنف و مولف کو مبارک باد پیش کی۔ صدر اجلاس پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے سیمینار اور سعادت حسن منٹو کے فن اور شخصیت نیز اجلاس میں پڑھے گئے مقالوں کا مفصل جائزہ لیا۔ 'منٹو کے افسانوں میں متن کی تحلیل اور معنویت کی تلاش' کے عنوان سے موصوف نے اپنا مقالہ بھی پیش کیا۔ منٹو کی تخلیقات کی اعداد شماری کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ منٹو نے اپنی مختصر زندگی میں 270 افسانے، 158 ڈرامے، 60 مزاحیہ پارے، 22 خاکے، 1 ناول، 18 فلموں کی اسکرپٹ اور مکالمے (16 ہندستان میں اور 2 پاکستان میں) لکھے۔ ان کے خطوط کے 2 مجموعے شائع ہوئے۔ 28 کتابیں اب تک ان کے فن پر شائع ہو چکی ہیں جب کہ 4 حضرات ان کی حیات و فن پر پی ایچ ڈی کے مقالے قلم بند کیے ہیں۔ علاوہ ازیں لفظ منٹو کے تلفظ اور ماخذ پر بھی انھوں نے وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ منٹو کا درست تلفظ منٹو ہے نہ کہ منٹو۔ منٹو کا تعلق من ولی گھرانے سے تھا اس بنیاد پر انھوں نے اپنے تاریخی نام 'سعادت حسن' میں 'منٹو' کا لاحقہ لگایا۔ منٹو ولادت صدی کے پس منظر میں منعقد کیا جانے والا یہ قومی سطح کا سیمینار شاندار کامیابی کے مرحلے سے گزرا جس میں پیش کیے گئے تمام مقالے کارآمد تھے۔ سیمینار کے جملہ اجلاس کی نظامت کا فریضہ ڈاکٹر افتخار احمد نے ادا کیا۔

☆☆☆

# اردو گھر میں ممتاز شاعر، ادیب، محقق اور دانشور

# جمیل الدین عالی کی سالگرہ تقریب کا انعقاد



راجو جمیل کو انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی گلدستہ پیش کرتے ہوئے

تصویر میں (دائیں سے بائیں): جناب محمد اقرار حسین (پرنسپل دہلی پبلک اسکول، متھرا روڈ، نئی دہلی)، جناب راجو جمیل، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر اطہر فاروقی اور جناب سید شریف الحسن نقوی

نئی دہلی (۲۰ر جنوری)۔ اردو کے مشہور و ممتاز ادیب، شاعر، محقق اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمد اعزازی جناب جمیل الدین عالی (ولادت: ۲۰ر جنوری ۱۹۲۵ء، دہلی) کی انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر، نئی دہلی میں اٹھاسی ویں سالگرہ منائی گئی۔ تقریب کی صدارت انجمن کے صدر پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے فرمائی۔ اس موقعے پر جمیل الدین عالی صاحب کے صاحبزادے جناب راجو جمیل جو پاکستان سے تشریف لائے ہوئے تھے، وہ اس تقریب میں بذات خود شریک تھے۔ راجو جمیل صاحب نے اپنے والد محترم کی شخصیت و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میرے بابا یعنی جمیل الدین عالی صاحب ایک اچھے ادیب، محقق اور دانش ور کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی ہیں۔ ادب، آرٹ اور دیگر فنون لطیفہ میں میری گہری دل چسپی دراصل انھی کی تربیت اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔

جمیل الدین عالی صاحب دہلی میں ہی پیدا ہوئے تھے اور تقسیم تک وہ دہلی کے گلی قاسم جان، بلّی ماران میں قیام پذیر رہے۔ بعد میں وہ پاکستان ہجرت کر گئے جہاں وہ کئی علمی، ادبی اور سرکاری اداروں کے سربراہ رہے۔ اس وقت بھی وہ انجمن ترقی اردو پاکستان کے معتمد اعزازی کے علاوہ کئی اداروں سے وابستہ ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے جمیل الدین عالی صاحب کے صاحبزادے راجو جمیل کی اردو گھر میں آمد پر ان کا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ راجو جمیل صاحب خود بھی پاکستان کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ انھوں نے اب تک 325 سے زیادہ ٹی وی ڈراموں اور ٹیلی فلمز میں کام کیا ہے اور 20 سے زیادہ اسٹیج ڈراموں میں حصہ لیا جو پاکستان کے علاوہ بحرین، قطر، ابوظبی، دبئی اور عمان میں پیش کیے گئے۔ فی الحال کراچی میں چار ڈراما سیریل میں کام کر رہے ہیں۔

اس موقعے پر ڈاکٹر اطہر فاروقی نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی مختصر تاریخ بھی بیان کی۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے جمیل الدین عالی صاحب کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ عالی صاحب کا شمار اردو کے معروف اور مقبول شاعروں میں ہوتا ہے۔ ان کی طویل نظم 'انسان' کو غیر معمولی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ نثر نگاری میں بھی انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

جناب سید شریف الحسن نقوی نے جمیل الدین عالی کے علمی و ادبی کارناموں کو قابل قدر بتاتے ہوئے کہا کہ وہ ایک عظیم فن کار ہیں۔ انھوں نے کئی معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں جنھیں ادبی دنیا میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے جمیل الدین عالی صاحب کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ وہ جب کبھی بھی ہندستان آتے تو انجمن کے دفتر میں بھی تشریف لاتے، اُن سے کئی خوش گوار ملاقاتیں ہوئیں۔ وہ دوستوں کے دوست اور ایک انتہائی ملنسار شخصیت کے مالک ہیں۔

جناب راجو جمیل نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے مختلف شعبوں کا بھی معائنہ کیا، خاص طور سے انجمن کی شبلی لائبریری اور آرکائیوز میں گئے جہاں انھوں نے جمیل الدین عالی صاحب کی متعدد کتابوں اور خطوط کو دیکھ کر انتہائی بے پناہ مسرت کا اظہار کیا۔

جناب راجو جمیل کے ساتھ اس ملاقات میں جو دیگر اراکینِ انجمن شامل تھے ان میں پروفیسر محمد ذاکر، ڈاکٹر فیروز دہلوی، دہلی پبلک اسکول متھرا روڈ کے پرنسپل جناب محمد اقرار حسین اور ڈاکٹر عبدالرشید وغیرہ کے نام ہیں۔

(یہ پریس ریلیز انجمن نے ۲۱ر جنوری کو جاری کی)

☆☆☆

**ادارے کا مضمون نگاروں سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے ـــ (ادارہ)**

ایڈیٹر: **اطہر فاروقی**
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں  مطبوعہ: شمر آفسٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org